Negotiations 1:3 (2021) pp. 01-10 **ISSN: 2789-293X**

اردو نظم میں ہجرت وجلاوطنی کا تصور اور نظریہ نوآبادیت

Concept of Migration and Exile in Urdu Nazm and the Ideology of Colonialism

Muhammad Aman Ullah Khan
Ph.D. Scholar, Urdu Department, Federal Urdu University, Islamabad.

KEYWORDS

Migration
Exile
Base
Diaspora
Release
Division
Scatter

DATES

Received	20-10-2021
Accepted	08-12-2021
Published	21-12-2021

QR CODE

ABSTRACT

Colonialism is strictly referred to the policies and Methods by an Imperial Power maintained and extended its control over the territories or People. A policy of extending a Country's Power and influence through diplomacy or military. It also affects the literature of the Subject Country which is controlled by the colonialist. This Article Present an analysis of Colonial system and its impact for migration and its hurdles in Urdu Poem.

DOI: https://doi.org/10.54064/negotiations.v1i3.24

آج کے اس جدید اور پیچیدہ دور میں جہاں پوری دنیا کو ایک Global village سے تشبیہ دی جارہی ہے، کسی بھی انسان کا اپنے مرکز پر ٹھہرنا اور قائم رہنا خاصا مشکل امر ہے۔ زندگی کی ان پیچیدگیوں کا مطالعہ تہذیب وثقافت کی تبدیلی سے بہ آسانی لگایا جاسکتا ہے۔ اس تبدیلی کی زد میں روایات واقدار، سیاسی، سماجی، معاشرتی، تہذیبی، ثقافتی، معاشی، نفسیاتی، علمی وفکری غرض زندگی کا ہر شعبہ آجاتا ہے۔ زندگی اب شاید مادیت پرستی اور خواہشات کے تتبع کا نام بن گیا ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے فرار ممکن نہیں۔ ادب میں اس احساس کے اظہار نے کئی صورتیں تشکیل پائی ہیں۔ وقت کی اس مادیت پرستی کا ایک اہم ترین جزو ہجرت اور انتقال آبادی ہے جو اس دور کے انسان کی زندگی میں کسی نہ کسی صورت میں وارد ہوئی، ہو رہی ہے اور ہوتی رہے گی خواہ یہ ورود جبری صورت میں ہو جسے جلاوطنی کہتے ہیں، رضاکارانہ ہو چاہے قانونی یا غیر قانونی، ذہنی، خارجی یا جسمانی نقل مکانی یا ہجرت ہو یہ سلسلہ زندگی کے آغاز سے ہی قائم ودائم ہے۔ تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ یہ سلسلہ آغاز آفرینش سے چل رہا ہے۔ جیسا کہ قرآن

پاک میں انسان کی تخلیق کے قصہ میں واضح اشارہ ہے کہ انسان کی تخلیق کا مقصد ہی نیابت الٰہی تھا اور اس کا مستقر جنت نہیں بل کہ زمین تھا جسمانی تخلیق چوں کہ مٹی سے ہوئی تو جسم کا مستقر زمین ٹھہرا اور روح کا تعلق چوں کہ امر ربی سے تھا تو اس کا مستقر علیین اور سجین کو ٹھہرایا لہٰذا ہجرت کا تصور انسان کی تخلیقی مقاصد میں ہی شامل کر دیا گیا۔ نقل مکانی کا یہ سلسلہ ازل سے تھا ابد تک رہے گا۔ انسان وقت کے دھارے میں بہتا بہتا نہ جانے کہاں سے کہاں نکل آیا اور نہ جانے کتنے ساحل بسائے، ساحلوں پہ آبادیاں بسائیں پھر ان بستی کو چھوڑ کر نئی بستیاں بسانے اور پھر نئی بستیاں بسائیں اور انسان ان نئی اور پرانی بستیوں کا حصہ ہونے لگا۔ کبھی اجنبی دیسوں میں بیگانہ ہوا کبھی ان بستیوں کو اپنالیا۔ کبھی کسی وجہ سے اپنی زمین اور تہذیب کو چھوڑا او رخش و خاشاک کی طرح زمانے کی گرد میں بکھر گیا"ہجرت": خانہ بدوشی، نقل مکانی، جلاوطنی، تقسیم وطن، شہر ممنوعہ، یا شہر تمنا، ارض موعودہ یا جنت گم گشتہ کی تلاش، کبھی خوشی کی تلاش تو کبھی سکون کے حصول کے لیے انسان بار بار اپنی زمین، اپنے ماضی، اپنی بنیادوں سے علیحدہ ہو کر ماضی اور اپنی زمین کی یادوں کو وطن کے روپ میں ذہن میں بسا کر مسلسل اذیتوں اور درد و غم سمیٹتے ہوئے وقت کے دھارے میں بہتا چلا گیا۔ انھی اذیتوں اور درد و غم کے کرب کو وہی محسوس کر سکتا ہے جس نے ہجرت اور جلاوطنی کے عذاب کو جھیلا ہو۔

آج اس جدید دور میں ہجرت اور جلاوطنی کے انسانی نفسیات پر جس قدر گہرے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں شاید ماضی میں نہ تھے۔ یہ اثرات نفسیاتی اور فکری سطح پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ انہی اثرات نے ادب میں تخلیقی تجربے کی گہرائی اور گہرائی کے احساسات کو انتہائی مضبوط بنیادوں پر پیش کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ادب میں ہجرت کا تجربہ ہمیشہ ہی تخلیقی سطح پر بڑا بار آور اور زرخیز رہا ہے ادب میں ہجرت اور جلاوطنی میں ماضی کے کرب اور المیہ کو حساس سطح پر پیش کیا جاتا رہا ہے انسان ہمیشہ سے اپنی سرزمین وطن سے جڑنا اور اس جڑت کو اپنے ساتھ رکھنا پسند کرتا رہا ہے اور اس کے یہ تصورات ایک (Fantasy) خیالی دنیا پر مبنی تصورات و جذبات اور شعور کا حصہ رہے ہیں اگر چہ دیکھا جائے تو تعلیمات الٰہیہ کی روشنی میں انسان کو مال و دولت کی ہوس کے ساتھ ساتھ زمین سے وابستگی کے جذبات و تصورات کو حوصلہ شکنی کی گئی ہے۔ البتہ انسان نے اپنے وطن کی سرزمین کو ماں کا رتبہ دے کر اپنی جنم بھومی سے جڑے رہنے کے جذبے کی پاس داری کی ہے اور اپنے گرد و پیش کے مناظرِ فطرت، مظاہر حیات سے جذباتی وابستگی اس کی گھٹی میں شامل ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ الہامی مذاہب کے پیروکاروں کے ہاں ہی ارضی لگاؤ کا جذبہ ایک بشری کمزوری کے طور پر سامنے آتا ہے اس کے برعکس اس جدید دور کی سائنسی اور مادی ترقی کی دوڑ نے اس کی اس کمزوری کو ایک اور جہت سے روشناس کر رہا ہے جہاں اخلاق، مذہب، اعلیٰ انسانی اقدار، اوصاف و اخلاص بھی موجود ہوتے نظر آتے ہیں یہ جہت مادہ پرستی ہے۔ دور حاضر کی روح عصر مادیت پرستی کا عکاس ہے۔ خاص نو آبادیاتی نظام اور اس کے بعد کے حالات زندگی کی تمام تر تگ و دو کا محور و مرکز مادیت پرستی ہے۔ اسکا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ جب مادیت پرستی ہی زندگی کا مطمع نظر ہے تو نو آزاد اقوام آج بھی مابعد نو آبادیات میں پھنسنے یا جکڑے جانے کے لیے تیار ہو جاتی ہیں مابعد نو آبادیاتی نظام میں مادیت پرستی کا یہ رویہ افراد یا عوام کی کایا کلپ کا باعث بننے کے ساتھ ساتھ زندگی کی وہ اقدر جن کا تعلق اخلاق اور مثبت طرز عمل سے ہے بالکل معدوم ہوتی جارہی ہیں۔ انسان فرد واحد پہلے سے کہیں زیادہ آبادی ہونے کے باوجود خود میں تنہائی، اکیلے پن اور مادی خواہشات کے حصول کا شکار ہوتا نظر آرہا ہے۔ یہ تضاد بالکل سمجھ سے بالاتر ہے کہ جوں جوں دنیا سمٹتی جارہی ہے افراد کا احساس تنہائی اور بڑھتا جارہا ہے۔ اسی کے سبب زبان، ثقافت اور تہذیب میں بھی تبدیلی پیدا ہو رہی ہے۔ اکیسویں صدی مسلسل تبدیلی کی زد میں ہے اسی تبدیلی کے سبب انسان نے اپنی فطری کمزوری (وطن)، اپنی شناخت کے بنیادی حوالہ (جنم بھومی، جائے

پیدائش) سے دستبرداری کو بھی قبول کرنا پسند کر لیا ہے۔ آج کا انسان خصوصاً تیسری دنیا کے ممالک میں بسنے والی عوام وطنیت کے بنیادی تصور سے خود کو آزاد کرا کر خود کو مابعد نو آبادیاتی جدید نو آبادیاتی نظام میں ضم کر رہے ہیں۔

تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ تاریخ انسانی کا ہجرت اور جلاوطنی سے تعلق خاصا پرانا اور گہرا رہا ہے اور ہجرت کی جبری شکل سے واسطہ تو آدم اور خدا کی معتوب قوم یہودیت، آغازِ اسلام میں پاک رسول ﷺ اور ان کے ساتھیوں، کبھی جنگ وجدل اور کبھی آفات ومصائب کے زمانوں میں متاثرین کی شکل میں قائم ہوتی رہی ہے۔ ہجرت وجلاوطنی کا سبب کچھ بھی ہو لیکن:

> "تاریخ انسانی میں نقل مکانی کا عمل ایک مسلسل سفر کی صورت میں اثر پذیر ہوا ہے۔ جو محض جسمانی ہی سفر نہیں بل کہ ذہنی سفر بھی ہے یہی ذہنی سفر انسان کو بیک وقت حال اور ماضی میں یکساں متحرک رکھتا ہے جو بالآخر ناسٹلجیا کی دین ہے، ناسٹلجیا کا یہی وہ تخلیقی جذبہ ہے جو ساں بیلو اور آئزک سنگر سے پولینڈ کی جنت گم گشتہ کا بادنامہ رقم کراتا ہے جوزف کانریڈ کو اجنبی سرزمینوں کی طرف لے جاتا ہے۔ اسی احساس کی لو میلان کنڈیرا کو اپنے لوگوں اور اپنی مٹی کی بنتی بگڑتی صورتوں کے خواب دکھاتی ہے۔ البرٹ کامیو، کے اجنبی سے تو ایک زمانہ واقف ہے لیکن دنیا بھر کے افسانوی اور داستانوی ادب میں کتنے ہی اجنبی ہمیں نظر آتے ہیں جو اپنی مٹی سے دور ہیں اور اس کی یاد ان کی تہوں میں سرسراتی ہے "[1]

دیکھا جائے تو برصغیر پاک وہند کا خطہ بھی ہجرت، جلاوطنی اور حملہ آوروں کی تاریخ کے حوالہ سے خاصا مشہور ومعروف رہا ہے۔ انیسویں صدی اور بیسویں صدی مین اس خطہ زمین نے اپنی تاریخ کو ہولناک ترین ہجرت کا تماشا دیکھا جس کے سبب فسادات اور ان فسادات سے لاکھوں انسانوں کے خون سے تاریخ نے خراج وصول کیا۔ ہجرت وجلاوطنی کا یہ تجربہ ایک ایسے المیے کی شکل اختیار کر گیا جس نے ادب، سیاست، معیشت، معاشرت، مرتب ہے۔ نو آبادیاتی نظام ہو یا مابعد نو آبادیاتی ہر دونے اپنے اپنے دائرے میں آنے والی مفتوح اور معتوب قوم سے پورا پورا خراج ہر سطح پر وصول کیا ہے۔ یہ خراج وسائل فطرت اور بشریت پر قبضہ کی صورت میں وصول کیا گیا۔ یہی خراج مفتوح اور معتوب اقوام کو ہجرت اور جلاوطنی پر مجبور کرتا ہے۔ اس حوالہ سے درج ذیل بیان ملاحظہ ہوں: "یورپی نو آبادیاتی نظام نے خاص طور پر انیسویں اور بیسویں صدی کے لوگوں کو اپنے ہی وطن میں بے گھر، جلاوطن اور اجنبی بنا دیا۔ الجزائر کے جو یورپ کی نو آبادی (colony) تھا، ادب میں جلاوطنی کی ایسی نوعیت ملتی ہے جس میں لوگ اپنے وطن میں رہتے ہوئے جلاوطن ہو گئے ہیں اور یورپی جارحیت کو برداشت کر رہے ہیں"[2]

تہذیب وثقافت اور زبان کا واسطہ جب ایک مختلف تہذیب وثقافت اور زبان سے ہوتا ہے تو زبان کی تبدیلی اور تہذیب وثقافت میں تبدیلی ناگزیر ہو جاتی ہے۔ برصغیر پاک وہند کا خطہ جہاں آریاؤں اور ان سے پہلے دراوڑ، پھر مسلمان فاتحین اور صوفیا کرام کی آمد، مقامی آبادی سے میل جول کے نتیجہ میں ایک ملی جلی تہذیب نے جنم لیا اور اس تہذیب کے سبب ایک نئی زبان وجود میں آئی نئی تہذیب وثقافت اور زبان کی تشکیل اور شکست وریخت کے کئی مراحل سے گزرا ہے۔ دور جدید میں ہجرت وجلاوطنی کا تصور بھی ایک ایسی تہذیب اور ثقافت کے ساتھ ساتھ کلچر کو بھی فروغ دے رہا ہے جہاں میزبان تہذیب اور ثقافت اور ہجرت وجلاوطنی ایک دوسرے سے زبان اور کلچر کے نئے مباحث کو فروغ دیتے اور ایک دوسرے سے مکالمہ کرتے نظر آتے ہیں۔ ہجرت، جلاوطنی، ترک وطن بکھراؤ دور حاضر کے انسان کی زندگی پر اثر انداز عوامل میں آج بھی ایک طاقت ور عنصر کی حیثیت

---

[1] رومیتری الماس، **اردو افسانے میں جلاوطنی کا اظہار** (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، 2012ء)، 20۔

[2] **ایضاً**، 21۔

رکھتے ہیں۔ مابعد نو آبادیاتی مطالعہ میں ایسے عوامل کے مطالعہ کے لیے "ڈائیاسپورا"[3](Diaspora) کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ یہ لفظ یونانی الاصل ہے جو دو متضاد و معانی اپنے اندر رکھتا ہے Dia بمعنی بکھیرنا، انتشار، تقسیم اور Spora بمعنی بیج بونا، جہاں ایک طرف اس اصطلاح میں انتشار، تقسیم اور بکھراؤ کو بیان کیا گیا تو دوسری طرف استحکام، نئی جڑوں اور نئی زندگی کے آغاز و تلاش کا اظہار بھی موجود ہے۔

ڈائیاسپورا، بکھراؤ، انتشار یا جلاوطنی کی اصطلاح مابعد نو آبادیتی مطالعہ میں یہودیوں کی جلاوطنی اور ان کی وطن واپسی کی شدید خواہش کے لیے استعمال کی گئی۔ اس اصطلاح کا استعمال ولیم سفران نے 1919ء میں یہودیت کی ہجرت کے تاریخی تناظر میں کیا اور اس اصطلاح کے خدوخال کا احاطہ کرنے کی پوری سعی کی۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ولیم سفران نے احساس ہجرت اور مہاجریت کے لیے صرف یہودیت کو ہی رول ماڈل Role Model کیوں رکھا جب ان کے سامنے فلسطینی، چینی، آرمینی اور ہندوستانی کی مثالیں بھی موجود تھیں۔ کسی ایک قوم یا کمیونٹی کو بطور مثال کے پیش کرنا ان کی ادبی تحقیق میں جانبداری کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ حالانکہ بعد کے ناقدین جن میں مکف فورڈ، ہومی کے بھابھا، ایڈروڈ سعید، سموئیل ہنٹنگٹن پی وغیرہ نے اس اصطلاح کو وسیع تر تناظر میں پیش کیا ہے۔ ولیم سفران کے نزدیک ہجرت، جلاوطنی، تارک وطن دراصل کسی ملک کے باسیوں کو ان کی جائے پیدائش یا وطن سے زبردستی، سیاسی، معاشی یا معاشرتی دباؤ کے تحت جدا کرنا ہے لہٰذا ہجرت کرنے والے مہاجرین، یا جلاوطن لوگ اپنے احساس مہاجریت کے ساتھ کسی اجنبی دیس میں، اجنبی لوگوں کے ساتھ زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں البتہ شعوری یا غیر شعوری طور پر وہ اپنے میزبان دیس میں اپنی جڑیں پیوست نہیں کرنا چاہیے۔ وہ اپنے اصل وطن اور اس وطن سے جڑی اپنے ماضی کی یادوں کو اپنے سینے سے لگائے رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی یا برصغیر پاک و ہند کے مہاجرین و جلاوطن ہمیشہ اپنے آبائی وطن سے قدامت پسندانہ لگاؤ اور انس رکھتے ہیں۔ اپنے ملک کی تعمیر و ترقی اور خیر خواہی کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں۔ اسی کے سبب پرائے دیسوں میں اجنبیت، مغائرت، بیگانہ پن، ذہنی تنہائی اور فرقت ان کی اداسی میں اضافہ کا سبب بنتی ہے۔ وہ کبھی بھی نئی جگہ یا نئے ملک کی تہذیب و ثقافت کو اپنا نہیں سمجھتے۔ ان کو ہمیشہ یہی احساس رہتا ہے کہ ان کا حقیقی وطن ہمیشہ ان کا اپنا ہی وطن ہے۔ نئے ملک کی تہذیب و ثقافت اور ثقافتی روایات و اقدار انہیں ہمیشہ اجنبی، سرد مہر اور نامانوس ہی لگتی ہیں۔ وہ اپنی یا آئندہ نسلوں کو میزبان تہذیب و ثقافت میں مدغم نہیں کرنا چاہتے ان کا مذہبی اور نسلی شعور ان کو اپنی آبائی شناخت اور تہذیبی و ثقافتی پہچان سے جڑے رہنے پر مجبور کرتا ہے۔ وہ اپنی جڑوں سے ہمیشہ جڑے رہنے کو ہی اعلیٰ خیال تصور کرتے ہیں۔ وطن سے دوری کو ایک کرب کی صورت محسوس کرتے ہیں۔ ان افراد کے لیے ان کی شناخت، تشخص ہی ان کے ذہن و قلب میں سب سے بڑا مسئلہ بن کر ابھرتا ہے۔ ڈائیاسپورک ادب کا سب سے بڑا سوال تہذیبی شناخت کا ہے۔ کل کا ادیب جو کچھ عرصہ قبل فرد کی گمشدگی کا اعلان کر رہا تھا آج اپنی ہی تہذیب و ثقافت کے حوالہ سے اپنی شناخت اور تشخص کے لیے نوحہ کناں ہے۔ فرد کے تشخص کی شناخت کے حوالہ سے یہ بیان ملاحظہ ہو: "ادب شناخت کو بنانے اور ان کی تصدیق کا ایک طریقہ کار ہے یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ ہمارے زمانے کی ایک علامت کے طور پر شناخت کی سیاست کو ایک ایسی بین مرکزیت حاصل ہو گئی ہے جس نے ادب کے روایتی تصورات کو پس پشت ڈال کر انہیں اذکار رفتہ بنا دیا۔ ایک جہت میں چلنے والا ادب نو آبادیاتی ادب، ہجرت اور ترک وطن کا ادب (Diaspora) صہیونی ادب، سیاہ فاموں کا

[3]www. en.wikipedia.org/Diaspora

ادب، نسائی ادب، ہم جنسی کا ادب، دلت ادب، اقلیت کا ادب، زندانی ادب، احتجاجی ادب وغیرہ یہ سبھی تصورات شناخت کو سب سے اہم اور بنیادی مسئلہ قرار دینے پر اصرار کرتے ہیں"[4]

ہجرت کے تجربہ اپنی قدامت کے اعتبار سے اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ خود انسان، انسان کی زندگی اور خصوصاً اس دور جدید میں مابعد نو آبادیاتی یا پوسٹ کولونیل یا پس نو آبادیاتی نظام کے تحت حیات انسانی میں جن تغیرات اور نفسیاتی مدوجزر کا سبب بن رہا ہے۔ ادبی متون خاص پس نو آبادیاتی نظام کے تصورات میں ہجرت، جلاوطنی اور تارک الوطن کے مسائل یا ان کی کش مکش حیات کا بیانیہ ایک واضح عنصر کے طور پر موجود ہے۔ مابعد نو آبادیاتی سماج تہذیبی و جغرافیائی انتشار بکھراؤ کو جنم دیتا ہے۔ پس نو آبادیاتی تصورات ایک دنیا کی شناخت اور دوسری محکوم و کمزور یا اصطلاحاً تیسری دنیا کے معدوم ہونے کی بازگشت ہے۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر کا کہنا ہے کہ: "یہ دنیا کسی غیب، کسی عدم سے اچانک خدائی حکمت سے وجود میں نہیں آئی بل کہ ایک دوسری دنیا کی شکست وریخت کے سوچے سمجھے پراجیکٹ کے طور پر وجود میں آئی ہے"[5]

یہ دراصل وہ نظام حیات ہے جس میں مالیاتی نظام پر اپنی جڑیں مضبوط کرتا ہے اور یہ زندگی کی اقدار کو مادیت پرستی کے تناظر میں دیکھتا ہے۔ نو آبادیاتی نظام کے خاتمہ پر تاریخ جس ہجرت اور جلاوطنی / تارک الوطنی کا مشاہدہ کرتی ہے ادب میں بھی اس کا خاصا شدید رد عمل سامنے آیا ہے۔ ہجرت اور جلاوطنی خواہ نو آبادیاتی نظام کے اندر ہو یا بعد نو آبادیاتی نظام کے ہمیشہ مہاجرین اور تارک الوطنی اور جلاوطن لوگوں میں ایک احساس پیدا کرتی ہے جو بڑھتے بڑھتے احساس محرومی تک پہنچتا ہے اس احساس کی نفسیاتی اور جذباتی سطح پر بہت سی اقدار قابل مطالعہ ہیں۔ بہر حال 1947ء کی ہجرت کا ادب میں بھرپور اظہار ملتا ہے۔ اردو زبان و ادب کے لکھاریوں کے سامنے برصغیر پاک وہند کے حوالہ سے ڈائی سپورا کا سب سے اہم سوال یا حصہ برصغیر کی آزادی کے بعد کا وقت ہونا چاہیے۔ برصغیر پاک وہند کے ڈائی سپورا کا اہم ترین جز مسلم متوسط طبقہ ہے جو ابھی تک اپنی اس نفسیات سے باہر نہ آسکا کہ کبھی ان کے آباؤاجداد نے بھی وہاں حکومت کی تھی۔ اس کے برعکس برصغیر پاک وہند اپنی آزادی کے ستر سال بعد بھی احساس کم تری میں مبتلا ہے اور احساس غلامی آج بھی ذہنوں میں ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مغرب کی وکٹوریائی اقدار کی برتری اور علویت کو ذہنوں پر ملکیت حاصل ہے اردو زبان اور ادب میں اس احساس کا اظہار کبھی اخباری اور خبری سطح پر ہوا۔ ہجرت اور جلاوطنی اور آزادی برصغیر میں مارے جانے والوں اور متاثرین کی عدولی خبر کا اظہار افسانوں میں نظر آتا ہے جب کہ دوسری طرف اس کا اظہار وسیع تر سیاسی، سماجی، معاشرتی، نفسیاتی، علمی وفکری تناظر میں انسانی المیہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں اردو ادب کے نمائندگان شعرا (نظم وغزل ومرثیہ و شہر آشوب) اور نثر میں افسانوی ادب وناول نے اپنا بھرپور حصہ ڈالا۔ اس دور کے ادبا نے اس خط کی عمومی نفسیات کے برعکس اسے نوشتہ تقدیر کا درس دینے کی بجائے اسے بشری سطح پر پیش کیا۔ برصغیر میں ہجرت عمل تقسیم اور فسادات کے بعد پوری شدت سے ابھر کر سامنے آیا۔ جوں جوں حالات میں تبدیلی آتی گئی ان فسادات اور ہجرت کے واقعات کے اسباب کے اثرات میں کمی ہوتی گئی، البتہ پاکستان کے حوالہ سے مارشل لاء، 1965ء کی جنگ اور بعد ازاں 1971ء کی جنگ اور مشرقی پاکستان کی بنگلہ دیش کے طور پر نمودار ہونے نے پرانے زخموں کو پھر تازہ کر دیا۔ فوری نوعیت کے ان واقعات نے جو فوری رد عمل دکھایا تھا اس کے اثرات اب بھی محسوس کیے جاسکتے ہیں، لیکن گزشتہ دو تین دہائیوں میں ہجرت اور جلاوطنی کی جو نوعیت دیکھنے میں آئی ہے اس کر براہ راست ڈانڈے

---

[4] پروفیسر صغرا ابراہیم، **21 صدی کے ابتداء میں اردو افسانہ** (اسلام آباد: تبیان، 2011ء)، 299۔

[5] ڈاکٹر ناصر عباس نیر، **"سفید خون کی سیاست" مشمولہ کہانی گھر**، کتابی سلسلہ، 314 (2014ء)، 519۔

بین الاقوامی سیاست سے جا ملتے ہیں، خصوصاً 11/9 کے اثرات اور واقعات نے تمام شعبہ ہائے زندگی کو نہ صرف امریکہ بل کہ پوری دنیا میں متاثر کیا ہے۔ ان واقعات کے اثرات میں جو معاشرے سب سے زیادہ متاثر ہوئے ان کا تعلق نو آبادیاتی نظام سے آزادی پانے والے معاشرے اور پس نو آبادیاتی نظام کے زیر اثر لوگوں سے تھا۔ تقسیم ہند کے بعد مہاجرت کے لحاظ سے ہندوستانی مہاجرت کا تعلق تاریخی، سیاسی، معاشی، تعلیمی اور بہتر روز گار جیسے محرکات سے ہے اور اسی کے سبب ہندوستانی مہاجرت نے اپنی اس ہجرت کو مثبت سمت دی ہے اس کے برعکس پاکستانی ادب میں ترک وطن، ہجرت اور جلاوطنی کو انتہائی تکلیف دہ پیش کیا ہے۔ اگرچہ وطن سے دوری، خاصی تکلیف دہ اور فطری تقاضا ہے لیکن ہندوستانی ڈائیاسپورا نے اجنبی دیسوں میں اپنی کمیونٹی کے ارتباط اور باہمی میل جول کے سبب اپنے اس احساس تنہائی اور فرقت کے احساس کو کم کرنے میں کامیابی حاصل کرلی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستانی اور ہندوستانی اردو ادب میں ہجرت و جلاوطنی کا اظہار مختلف روش میں ہے اور دونوں ملکوں کے ادیبوں کے ہاں مختلف طرز احساس جنم لے رہا ہے۔ اسی طرز احساس کا نتیجہ ہے کہ جو اردو زبان و ادب میں لکھا جارہا ہے چاہے وہ جلاوطنی اور ہجرت کے حوالہ سے ہے یا تارک الوطنی کے حوالہ سے۔ وہ پس نو آبادیاتی سماج اور تہذیب وثقافت والے معاشرے میں اپنے لیے جگہ بنارہا ہے اور غالباً ہند پاکستانی تہذیب کی دیگر اقوام کے ساتھ باہمی میل جول یا ربط پیدا کرنے کی بہترین صلاحیت ہی اس کی تعمیر و ترقی اور وقت کے تقاضوں کے ساتھ ہم اہنگی میں توازن پیدا کرتی ہے۔ پاکستانی جلاوطن ادب کی جہات کا آغاز ہی ایسے ادیبوں نے کیا جو دراصل ہجرت کرکے اپنے نئے وطن اور ملک پاکستان آئے تھے۔ ہجرت تو کرلی مگر اپنے دل و دماغ کو پرانی یادوں اور پرانے دیس کے ساتھ ہی مربوط رکھا۔ یادوں میں آبائی وطن ہی آباد رہا۔ ایسا رویہ ہندوستان سے ہجرت کرکے آئے ہوئے ادیبوں کی تحریروں میں پایا جاتا ہے یہ دکھ اور درد کرب کی حالت کو اس وقت پہنچ جاتا ہے جب ان ادیبوں کی امیدوں اور خوابوں کی سرزمین پاکستان میں اپنی حیثیت اور امیدوں پر پانی پھرتا نظر آیا۔ تو ہر حساس اور باشعور ادیب چیخ اٹھا۔ ہجرت کے حوالہ سے یہ بیان قابل تحسین ہے: "ہجرت ایک زمین سے دوسری کی طرف سفر نہیں ہے بلکہ رشتوں کے جو انسانوں کے درمیان ہوں، ان علامتوں کے جو ان سے ظاہر ہوں ان ترجیحات اور معنویتوں کے پورے نظام سے جو اس سرزمین پر ایک تاریخ نے قائم کی ہوں، سفر ہے"[6]

ہجرت خواہ جبری ہو خواہ لوازمات زندگی کے حصول کے پیش نظر، نئی جگہ، نئی اقدار و روایات، ثقافت و تہذیب زبان کو اپنے ساتھ ہی لے آتی ہے۔ اسی کے سبب گزرا ہوا ماضی، اس کی یادیں، اس کی تہذیب و ثقافت اور گزشتہ زندگی کے اطوار اور عادات رسوم و رواج اور روایات کو دروازے کے باہر ہی چھوڑ کر اگلی زندگی اور اس کے مسائل اور ان کے حل کی طرف توجہ بھی کرنا پڑتی ہے۔ جلاوطن لوگ اجنبی دیسوں میں اپنی تقدیر کو سنوارنے کے لیے ہجرت کرگئے اور یہ ہجرت عموماً نو آبادیاتی نظام سے مابعد نو آبادیاتی یا پس نو آبادیاتی نظام کی طرف ہجرت ہے۔ اس ہجرت اور جلاوطنی کا مقصد محض خوش حالی کے اس سراب کے پیچھے بھاگنا ہے جو جدید دور میں خوشیوں کا واحد معیار بن چکا ہے۔ قیام پاکستان برعظیم کی تاریخ کا ایک بڑا واقعہ ہے۔ ہندو اس تقسیم کو برداشت نہ کرسکے۔ پاکستان محض ایک خطہ زمین نہ تھی بل کہ ایک مخصوص نظریہ، ثقافت، زبان، کلچر، رسوم اور تہذیب کا مرکز تھا۔ قیام پاکستان برعظیم کی تاریخ کا ایک ایسا واقعہ ہے جس کی بنیاد اسلام کے ساتھ ساتھ ایک مخصوص تہذیب، تمدن اور رسوم و رواج پر بھی ہے 1947ء کے بعد پاکستان میں اردو ادب کی صورت حال میں تبدیلی نمایاں طور پر دیکھی جاسکتی ہے تقسیم ہند کا براہ راست اثر ادب پر

[6] ڈاکٹر فاروق عثمان، **اردو ناول میں مسلم ثقافت** (ملتان: بیکن ہاؤس، 2002ء)، 423۔

پڑا۔ ادب کی تصانیف میں افسردگی، وطن سے دوری کا اثر، یاد ماضی، اپنوں کے بچھڑنے کا غم جیسے عناصر نمایاں دکھائی دینے لگے۔ اگر ہم نظم و نثر دونوں حوالوں سے دیکھیں تو دونوں اصناف نے اس تبدیلی کو گہرائی سے قبول کیا اور اس کے اثرات اس دور کی تصانیف میں واضح دکھائی دیتی ہیں۔ پاکستان کے قیام کے بعد جو نظمیں لکھی گئیں ان میں فسادات، ہجرت مہاجرین کی کسمپرسی، بے روزگاری، خون ریزی، زبوں حالی اور معاشی و معاشرتی ابتری اور بدحالی کو موضوع بنایا گیا۔

اردو نظم نے تقسیم برصغیر کے نتیجے میں ہونے والی ہجرت اور جلاوطنی سے پیدا شدہ مصائب کو کسی بھی دوسری صنف ادب سے زیادہ محسوس کیا اردو شاعری میں غم کی روایت تو میر تقی میر کے عہد سے بھی پیشتر رائج تھی جسے میر نے اپنی شاعری میں بیان کر کے عالمگیر حیثیت عطا کی۔ نظم ہو یا غزل غم اور درد کا شروع سے ہی چولی دامن کا ساتھ ہے۔ دوسرے لفظوں میں جہاں غم، دکھ، افسوس، کرب، ہو وہاں نظم یا غزل نہ ہو یہ کیسے ممکن ہے؟ ہجرت کے کرب میں دو طرح کی کیفیات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ایک تو آبائی وطن کی یاد ستاتی ہے جہاں بچپن اور جوانی گزری ہو یا پھر اس کی زندگی کی بیشتر یادیں اس مٹی سے وابستہ ہوتی ہیں یہی وجہ ہے کہ 1947ء میں بہت سے ایسے افراد جو بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھ چکے تھے وہ اپنے آبائی وطن کو چھوڑنے اور ایک نئے وطن میں آنے کے لیے تیار نہ تھے۔ نئی نسل اور پرانی نسل کے درمیان رشتوں میں دراڑ بھی اسی فاصلے "Generation Gap" کے سبب پڑی۔ دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ ایک نئے ملک، نئے وطن اور نئی جگہ پہ حالات کیسے ہوں گے؟ جب ہجرت کی منازل طے کرتے لوگ یہاں آئے تو انھیں جن حالات کا سامنا کرنا پڑا وہ بھی ان کے لیے خوش گوار نہیں تھے۔

بیسویں صدی کے تیسرے اور چوتھے عشرے میں سماج میں حقیقت نگاری کی تحریک شروع ہوئی تو اردو نظم نے بھی اپنا رخ بدلا۔ اس تحریک سے وابستہ شعرا نے سائنسی نقطہ نظر کرنے کے ساتھ ساتھ سماجی حقیقت نگاری کی سچی تصویریں پیش کرنا شروع کر دیں۔ اس دور کی نظم کے موضوعات میں انقلابی تبدیلی کے آثار ملتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے قیام کے کچھ عرصہ بعد حلقہ ارباب ذوق کی بنیاد رکھی گئی۔ اس سے نظم میں کسی حد تک ادبی اقدار کا نزول ہوتا ہے اور ادب برائے ادب کا نظریہ نظم کو لطیف خیالات سے واپس لطیف احساسات و جذبات کی ترجمانی کی طرف لے جاتا ہے۔ بیسویں صدی کے تقریباً وسط میں قیام پاکستان سے جہاں سیاسی، معاشرتی اور معاشی حالات میں تبدیلیاں آئیں وہیں انگریزوں کے سارے نو آبادیاتی نظام کا ڈھانچہ بھی بکھر گیا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ یہ تبدیلی مثبت انداز میں ظہور پذیر ہوتی لیکن ایسا نہ ہو سکا کیوں کہ تقسیم کے نتیجے ملکی سرحدیں ہی تبدیل ہوئی تھیں چہرے بدلے تھے سماج نہیں بدلے تھے، ظلم و جبر کے پیمانے نہیں بدلے تھے۔ اگر یہ سب کچھ نہیں بدلا تھا تو پھر نظم کیسے دکھوں کی جگہ، پھولوں کی نمائش کے اظہار بیان کے لیے اپنا دامن وسیع کر سکتی تھی۔ ملک نیا تھا لیکن نظام تو وہی گھسا پٹا، فرسودہ، جاگیرداری، زمینداری نظام، کچھ انگریزوں سے ادھار لیا ہوا، غلامانہ ذہنیت رکھنے والے سیاسی زعما سے یہ توقع رکھنا ہی عبث تھا کہ وہ غلامانہ نظام کی مذمت کرتے ہوئے ایک نئے ملک میں ایک نیا نظام نافذ کرنے کی بھرپور سعی کرتے۔

ملک میں 1958ء میں پہلے مارشل لاء کا نفاذ بھی ایک نئے نظام کی راہ کی رکاوٹ بنا۔ اس سے سوچ پر پہرے بٹھا دیے گئے۔ زبان بندی کا دستور نافذ کیا گیا۔ سیاست اور ادب ایک دوسرے کے مخالف ہو گئے۔ کسی بھی سیاسی حکومت کے لیے اس ماحول میں ایک غیر جانبدار ادب قابل قبول نہیں ہوتا۔ حکومتی اقدامات کی شدت دوسرے شعبہ ہائے زندگی میں تو تھی ہی لیکن ادب بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا نظم ایسے ماحول میں علامت کے طور پر آگئی اور بہت سے شعرا حکومتی اقدامات کی وجہ سے علامات کا سہارا لینے پر مجبور ہو گئے کہ اس دور میں جبر کے خلاف مزاحمت کے آثار نظر نہیں آتے ہیں جو تھوڑے بہت تھے بھی تو ان کو کسی نے اتنی اہمیت نہ دی۔ نظم میں مزاحمت سے زیادہ علامت کا دور تھا۔ پھر اسی علامت و

تجرید کی وسیع شکل نئی لسانی تشکیلات کی صورت میں ظہور پذیر ہوئی۔ اس دہائی میں در حقیقت نظم کی ہیئت میں توڑ پھوڑ کا عمل زیادہ نظر آتا ہے۔ نظم میں اس کا سہرا افتخار جالب کے سر بندھتا ہے وہ شعرا جنھوں نے ہجرت، جلاوطنی اور تارک الوطنی کا کرب محسوس کیا اور اپنی نظموں میں اس کا اظہار کیا ان میں فیض احمد فیض کی نظم "سحر"، مخمور جالندھری "اغوا"، تابش دہلوی "یاد" ظہیر کاشمیری کی نظم "زندگی"، ضیاء جالندھری کی نظم "اجلا" فکر تونسوی کی نظم "آزادی کے بعد" قیوم نظر کی "امن" مسعود حسن کی نظم "خلا" ساحر لدھیانوی کی نظم "مفاہمت" علی سردار جعفری کی نظم "خون کی لکیر" احمد ندیم قاسمی کی "مہاراج ادھیراج" اور کیفی اعظمی کی نظم "مصالحت" کو بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے۔ ناصر کاظمی اور حبیب جالب کی نظم تو اپنی مثال آپ ہے کلاسیکی نظم گو شعرا میں ناصر کاظمی پاکستانی نظم میں سرفہرست ہیں پاکستانی نظم کی یہ خوش قسمتی ہے کہ قیام پاکستان کے ساتھ ہی چند نام نظم و غزل کے افق پر ایسے ملے جنھوں نے اردو شاعری کو سہارا دیا۔ اس قافلے کے سالار اعظم ناصر کاظمی کو کہا جاسکتا ہے۔ ناصر کاظمی کے ساتھ ساتھ مصطفی زیدی، مجید امجد، ضیاء جالندھری، ادا جعفری، منیر نیازی، حبیب جالب، فیض احمد فیض، پروین شاکر وغیرہ شامل کیے جاسکتے ہیں۔ شاعری میں 1947ء کی شدت اور ہجرت کے کرب کو جس طرح ناصر کاظمی نے اپنی شاعری کا حصہ بنایا اس کی مثال دوسرے شعرا کے ہاں کم ملتی ہے۔ ان کی شاعری چاہے وہ نظم ہے یا غزل نے یاد ماضی کو بہت گہرائی سے محسوس کیا ہے اس درد اور کرب کی شدت کو ان کی شاعری میں بہ کثرت محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ناصر کاظمی کی شاعری میں بار بار گزشتہ دور کی عظمت رفتہ کو آواز دینے کا عمل بھی نظر آتا ہے ذیل کا بیان ملاحظہ ہو: "ناصر کاظمی نے میرؔ کی ہجرت کے تجربے کو تقسیم ملک کے بعد کی ہجرت کے عام تجربے کے تناظر میں دیکھا ہے اور اس سے ذہنی تاثرات اخذ کیے ہیں اس لیے ناصر کے ہاں میرؔ کے رنگ کا اثر ہے"[7]

پاکستانی شاعری میں ایک موڑ اس وقت جب ساٹھ کی دہائی میں لسانی تشکیلات کے حوالہ سے شاعری میں آنے والی تبدیلی کا عمل ستر (70) کی دہائی میں داخل ہو جاتا ہے اور مارشل لا کے بعد کے حالات میں تبدیلی آجاتی ہے لیکن چند ہی سال بعد پھر سے وہی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے اور شاعری کے اظہار پر طرح طرح کی قدغن لگائی جاتی ہے پھر اس دہائی کے آخر پر لگنے پر مارشل لاء سے مزاحمتی ادب کی راہ ہموار ہو جاتی ہے اور شاعری میں نیا لہجہ سامنے آتا ہے جو علامتوں کے معانی و مفاہیم ہی بدل کر رہ جاتے ہیں۔ اس دور کے معروف شعراء میں احمد فراز، سلیم شاہد، افتخار عارف، حمایت علی شاعر، حامد عزیز مدنی، منیر نیازی، عبید اللہ علیم، شہزاد احمد، جون ایلیا، کشور ناہید، حبیب جالب، فہمیدہ ریاض، پروین شاکر اور فیض احمد فیض کا نام شمار ہوتا ہے۔

اردو ادب میں ہجرت کا موضوع ایک خاص اہمیت رکھتا ہے ہجرت خواہ عارضی ہو یا مستقل یہ ایک محسوس ہونے والا عمل ہے۔ اپنے آبائی گاؤں، شہر اور ملک سے ہر فرد کو محبت ہوتی ہے۔ ہجرت صرف اپنے مولد سے بچھڑنے کا نام نہیں بلکہ یہ ایک تہذیب اور تمدن سے جدا ہونے کا بھی المیہ ہے۔ 1947ء کی اور نقل مکانی تاریخ کا ایک بہت بڑا المیہ بن کر ابھرا اور اس المیے کا سب سے خوف ناک اور دہشت ناک پہلو فسادات میں کم و بیش پانچ لاکھ انسانوں کا قتل ہو جاتا ہے جن کے سبب ہر طرف انسانی اعضاء کا بکھراؤ اور خون کی ندیوں کا بہنا تاریخ کے صفحات میں رقم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تقسیم برصغیر کے وقت نہ صرف ہمارا تہذیبی اور ثقافتی ورثہ زمانے کے ہاتھوں برباد ہوا بل کہ اس صورت حال کا اظہار شعر و ادب میں بار بار ہوا۔

---

[7] ڈاکٹر وقار احمد رضوی، **تاریخ جدید اردو غزل** (اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، 1988ء)، 108۔

ہجرت اور جلاوطنی کے حوالہ سے ہندوستان کے عظیم مفکر اور پس نو آبادیاتی نظام کے نقاد "ہومی کے بھابھا" نے لکھا: "ہم عصری تنقیدی نظریات کی وسعت اس امر کی شاہد ہے کہ ہم ان لوگوں سے جنہوں نے تاریخ کی سزا بھگتی ہو، غلامی غلبے، بکھراؤ (Diaspora) بے مکانی، زندہ رہنے اور سوچنے کے دیرپا سبق سیکھتے ہیں"[8]

اس میں کوئی شک نہیں کہ ادب کی جو بھی جہت ہو وہ انسانی زندگی کے تنوع، تغیر، تبدیلی اور آنے والے وقتوں کی کروٹ کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ Diaspora کے لحاظ سے تخلیق کیا جانے والا ادب بھی اس لحاظ سے وہی کردار ادا کرتا ہے جو کسی نئے معاشرہ، ملک، آبادی یا وطن اور سماج میں کلچر اور روزمرہ کو سمجھنے میں جلاوطنوں، مہاجرین اور تارکین وطن کو وہاں موجود ہم وطن فراہم اور مہیا کرتے ہیں۔ ادب کے سنجیدہ قارئین او رلکھاریوں کو یہ بھی سمجھنا ہو گا کہ ادب میں ہجرت اور جلاوطنی کے اعتبار سے جن جدید اقدار کو وہ فروغ دے رہے ہیں وہ اس گلوبلائزیشن کے دور میں فرد کی بہتری اور اس کی ترقی پذیر شعور کے لیے کس قدر مثبت یا مؤثر کردار ادا کر رہی ہے۔ ایک طرف وہ ادیب اور لکھاری ملتے ہیں جو جلاوطنی اور ہجرت کو ماضی سے جڑی یادوں، گم گشتہ جنت (آبائی وطن) اور تہذیبی نوحہ کا مقام دے رہے ہیں جب کہ دوسری طرف وہ ادیب اور لکھاری ہیں جو اس ہجرت اور جلاوطنی کے تصور سے نئے آنے والے زمانوں کے مسائل، مشکلات اور ان سے نمٹنے کیلیے آگاہی کا سامان کر رہے ہیں۔ مثبت رویے، مثبت سوچ اور اقدار پر مبنی تصورات سے فرد کی تہذیب ومعاشرت کو فروغ دے رہے ہیں۔ Diasporic ادب اس وقت علم بشریات اور کلچر کی تفہیم میں مدد ومعاون ہے، لہٰذا اس ادب کا مطالعہ مہاجرین، جلاوطن، اور تارکین وطن کے معاشی، معاشرتی، تہذیبی، ثقافتی، نفسیاتی، علمی وادبی اور فکری رویوں کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ پس نو آبادیاتی ادب میں ہجرت ایک بالکل الگ اور مختلف تناظر میں سامنے آتی ہے مختلف سماج اور معاشروں کا تضاد اپنی جگہ لیکن آج کا دور ماضی سے چمٹنے کی بجائے حال کا ماضی سے تقابل اور اس تقابل کی بناء پر مستقبل کی منصوبہ بندی کا دور ہے۔ قوموں اور افراد کے لیے زندگی متحرک اور مختلف النوع افراد سے معاملہ کرنے کا دوسرا نام اور کام بن چکی ہے۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ آج کے ادیب اور شعرا کو ناامیدی، یاس انگیزی، ماضی کے کرب، ہجرت اور جلاوطنی سے پیدا ہوتے دکھ اور درد، ملال اور المیاتی دنیا جو اس ہجرت اور جلاوطنی کے سبب جو مسافرت، بے چینی پیدا ہوتی ہے، سے نکل کر عملی تصورات کو اپنی زندگیوں میں مزین کرنا چاہیے، ماضی کو اگرچہ پیش نظر رکھا جائے البتہ ماضی کے ان اندوہ ناک یادوں کو سینے سے لگائے رکھنے کی بجائے اپنے حال اور اسی حال کے بل پر مستقبل کی فکر اور سوچ کرنی چاہیے تاکہ اس مادیت پرستی کے دور کا مقابلہ کیا جا سکے اور اپنے اوپر موجود نو آبادیاتی نظام کے اثرات جو اب مابعد نو آبادیاتی نظام یا پس نو آبادیاتی نظام کے سبب غلامانہ ذہن اور سوچ کے عکاس ہیں، سے باہر آیا جائے اور اپنے اسی ذہنی تسلط کو جڑے سے اکھاڑ پھینکا جائے اور ایک نئی اور روشن دنیا کا آغاز کیا جائے۔ ہجرت وجلاوطنی کے حوالہ سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

سناتا ہے کوئی بھولی کہانی

مہکتے میٹھے دریاؤں کا پانی

یہاں جنگل تھے آبادی سے پہلے

سنا ہے میں نے لوگوں کی زبانی

---

[8] دیویندر اسر، **"قرۃ العین حیدر۔۔ جلاوطنی کا ذاتی اور تہذیبی المیہ"** مشمولہ، سطور، خصوصی مطالعہ قرۃ العین حیدر (ملتان: بیکن بکس، 2003ء)، 520۔

یہاں اک شہر تھا شہر نگاراں

نہ چھوری وقت نے اس کی نشانی [9]

منیر نیازی نے لکھا:

ایک اور دریا کا سامنا تھا منیر مجھ کو

میں ایک دریا کے پار اترا تو میں نے دیکھا [10]

افتخار عارف کے بقول:

عذاب یہ بھی کسی اور پر نہیں آیا

کہ اک عمر چلے اور گھر نہیں آیا [11]

☆☆☆

[9] ناصر کاظمی، **دیوان ناصر** (لاہور: جہانگیر بکس، س۔ن ء)، 18۔

[10] www.Rekhta.com/ Muneer Niazi

[11] www.Rekhta.com/ Iftikhar Arif